© rasailojaraid.com

دنیائے اسلام کی موجودہ اسلامی تحریکیں

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی

[یہ مولانا کا دوسرا مقالہ ہے جو انہوں نے جماعت اسلامی پاکستان کے اجتماعِ عام منعقدہ کراچی میں پیش فرمایا]

پس منظر یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں کہ بارھویں صدی ہجری یا اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں دنیائے اسلام کا دینی و اخلاقی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اپنے تو اپنے غیر بھی قرن اول سے اس دَور کے مسلمانوں کا مقابلہ کرتے، تو انہیں تعجب اور افسوس ہوتا۔ ایک امریکی مبصّر لوتھرپ اسٹاڈرڈ (Lothrop Stoddard) نے اس عہد کی بڑی صحیح تصویر کھینچی ہے۔ امیر شکیب ارسلان[1] کی رائے میں بڑے سے بڑا دقیق النظر مسلمان عالم بھی اس سے زیادہ صحیح اور واضح تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا[2]۔ وہ لکھتا ہے:-

"مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا۔ تصوف کے طلسم و توہمات نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ جاہل عوام ان سے

---

[1] امیر شکیب ارسلان (ف ۱۹۴۶ء) اس عہد کے سب سے بڑے مسلمان عالم، مورخ اور سیاسی مفکر تھے۔ سید جمال الدین افغانیؒ کے خاص ارادت مندوں میں سے تھے۔ ترکی حکومت کے خاص ارباب حل وعقد میں ان کا شمار تھا۔ مرحوم انور پاشا سے خاص طور پر ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ طرابلس کے جہاد میں وہ انور مرحوم کے دوش بدوش کام کرتے رہے۔ عربی زبان و ادب میں انہیں امامت کا منصب حاصل تھا۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ صدیوں سے عربی زبان کا ایسا انشا پرداز پیدا نہیں ہوا۔ گو خود امیر شکیب مصطفیٰ صادق رافعی (ف ۱۹۳۷ء) کو "امامت" کا منصب دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں اس دور میں عربی زبان و ادب کے مجدد و امام تھے۔ امیر شکیب ارسلان کی سیاسی و تاریخی تصنیفات بھی نہایت ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

[2] حاضر العالم الاسلامی (ج ۱، ص ۲۶۰-۲۵۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے میں پھنس کر فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے، اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے، جن کی پرستش بارگاہِ ایزدی میں تشفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی . . . . قرآن مجید کی تعلیم نہ صرف پسِ پشت ڈال دی گئی تھی بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی . . . . یہاں تک کہ مقاماتِ مقدسہ بداعمالیوں کے مرکز بن گئے تھے . . . . فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی . . . . اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر دنیا میں آتے، تو وہ اپنے پیرووں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے[1]

یہی زمانہ ہے کہ غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور دنیائے اسلام کے مختلف حصّوں میں بیداری کے آثار ظاہر ہوتے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۵ - ۱۱۷۶ھ)، یمن میں محمد بن اسماعیل الامیر[2] (۱۰۹۹ - ۱۱۸۲ھ) اور نجد میں محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵ - ۱۲۰۶ھ) نے اصلاح و تجدید کا علم بلند کیا۔ ان کے بعد ہندوستان میں شہیدین (یعنی سید شہید بریلویؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ) نے شاہ صاحبؒ کے کام کی تکمیل کی۔ نجد میں آلِ سعود اور آل الشیخ (محمد بن عبدالوہاب کے بیٹوں اور پوتوں) نے مل جل کر دعوت و اصلاح کا کام جاری رکھا۔ یمن میں کوئی باضابطہ تحریک تو نہ اٹھی اور محمد بن اسماعیل الامیر کی دعوت بھی علمی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی تھی، تاہم اس میں حرارت تھی۔ الامیر کے بعد شوکانی (۱۱۷۳ - ۱۲۵۰ھ) نے ان کے نقشِ قدم پر یہ کام جاری رکھا۔ مگر اس میں حرارت اور داعی کا سا جوش نہ تھا۔ پھر بھی ان کی تصنیفات سے صدیوں کا جمود ٹوٹا اور حدیث و فقہ میں بحث و نظر کا دروازہ کھلا۔ اس دور کے دوسرے حصے میں سب سے جاندار ہمہ گیر تحریک طرابلس الغرب سے اٹھی، جس کے روحِ رواں محمد بن علی سنوسی

---

(۱) The New World of Islam ص ۲۵ - ۲۶ - ملخص۔

(۲) محمد بن اسماعیل الامیر یمن کے مشہور موحد، محدث اور عالم تھے۔ ان کی تصنیفات میں بلوغ المرام کی شرح سُبل السلام عام طور پر متداول ہے۔ توحید پر ان کا رسالہ تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد، محمد بن عبدالوہابؒ کی کتاب التوحید اور مولانا شہیدؒ کی تقویۃ الایمان سے بھی زیادہ صاف، واضح اور بے لچک ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۲۰۲ھ - ۱۲۷۶ھ / ۱۷۸۷ء - ۱۸۶۰ء) تھے، جو ان کے جانشینوں کے عہد میں اپنی قوت اور شباب کو پہنچی۔

انیسویں صدی عیسوی یا تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک ان دینی و علمی تحریکوں کا زور رہا۔ اس کے بعد سیاسی تحریکوں کا زور شروع ہوا۔ شروع شروع میں ان سیاسی تحریکوں کی سربراہی دیندار لوگوں کے ہاتھوں میں رہی۔ سید جمال الدین افغانی (وفات ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء) کی تحریک تو نصف صدی بلکہ زیادہ مدت تک مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ عبدالرحمٰن کواکبی[1] (وفات ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) نے بھی ایک عالمی اتحاد اور سیاسی وحدت کا خاکہ پیش کیا، مگر عملی طور پر وہ کچھ زیادہ نہ کر سکے۔

اسی زمانے میں دو نیم دینی و نیم سیاسی تحریکیں بھی نمودار ہوئیں، جو مخالف طاقتوں کی چیرہ دستیوں کے باعث ناکام رہیں، مگر اسلامی تاریخ پر اپنا ایک نقش چھوڑ گئیں۔ ان کے علم برداروں کے ذہن میں اسلام کا سیاسی و اجتماعی تصور بالکل واضح تو نہیں تھا، لیکن وہ اسلام کی محبت اور دین کی سربلندی کے جذبے سے سرشار ضرور تھے۔ ہمارا اشارہ الجزائر کے امیر عبدالقادر (وفات ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء) اور داغستان (روس) کے شیخ محمد شامل (وفات ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۱ء) کی طرف ہے۔ یہ دونوں سیف و قلم کے یکساں مالک تھے بلکہ امیر شکیب ارسلان کی زبان میں یہ قلم کی راہ سے تلوار کے مالک ہوتے۔ ان بوریا نشینوں نے دنیا کی دو بڑی طاغوتی طاقتوں فرانس اور روس کے چھکے چھڑا دیئے اور ان پر اپنی بہادری، مستقل مزاجی اور قائدانہ صلاحیتوں کی دھاک بٹھا دی۔

اسی زمانے میں سنوسی تحریک بھی طرابلس الغرب میں ترقی کرتی رہی اور دوسرے امیر محمد مہدی سنوسی (وفات ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۲ء) کے عہد میں اس نے خاص سیاسی طاقت حاصل کر لی۔ جس کا حقیقی مظاہرہ تیسرے امیر احمد شریف سنوسی (وفات ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۳ء) کے دور میں ہوا جنہیں امیر شکیب، سنوسی اعظم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ سنوسی تحریک، فروع اور جزئیات میں نرم اور کمزور ہونے کے باوجود اصل

---

[1] عبدالرحمٰن کواکبی، حلب کے ایک مشہور خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی کتاب "ام القریٰ" مشہور ہے۔ جس میں انہوں نے مسلمانانِ عالم کی ایک نمائندہ کانفرنس کا خاکہ پیش کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دین کا تصور رکھتی تھی اور اس کے چلانے والے کسی نہ کسی شکل میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہی کا احیاء چاہتے تھے۔

(۲)

ان نیم دینی و نیم سیاسی تحریکوں کا اثر کچھ نہ کچھ بیسویں صدی کے آغاز تک رہا۔ سنوسی تحریک کے اصل کارنامے تو اٹلی کے مقابلے میں ظاہر ہوئے۔ پورے بیس پچیس برس یعنی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۳ء تک، جس طرح طرابلس کے مٹھی بھر نہتے عربوں نے، یورپ کی ایک باجبروت حکومت کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے، تاریخ میں اس کی مثال کم ملے گی۔

لیکن انیسویں صدی کے وسط ہی میں قومی اور وطنی تحریکیں ابھرنا شروع ہو گئی تھیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں آہستہ آہستہ علم قیادت وطن پرستوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ ۱۹۰۸ء میں ترکی کے انقلاب اور انجمن اتحاد و ترقی کے عروج نے نیم سیاسی اسلامی تحریکوں کا مستقبل تاریک کر دیا۔ گو ترکوں میں سعید حلیم[1] اور انور مرحوم جیسے دو چار مسلمان سیاست کار اور جرنیل موجود تھے، مگر پلہ وطن پرستوں اور تورانی قومیت کے داعیوں ہی کا بھاری تھا۔ عربوں پر اس کا قدرتی ردعمل ہوا اور وہ بھی پرتول کر مقابلے پر آ گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر شاید ہندوستان کے سوا کوئی مسلمان ملک نہیں تھا جہاں سیاسی تحریکیں خالص وطن پرستی کی بنیادوں پر نہ چل رہی ہوں۔ چین، ملایا، انڈونیشیا وغیرہ بھی خالص اسلامی تحریکوں سے بالکل خالی رہے۔ عرب ملکوں کے لیڈر مصر کا حال اور بھی برا تھا۔ وہ زمین جہاں سید جمال الدین نے برسوں آبیاری کی، اس نے سعد زغلول (ف ۱۹۲۷ء) جیسے کٹر وطن پرست کو جنم دیا۔ وفد پارٹی برسر عروج آئی اور اس کے عروج کے ساتھ جو تھوڑے بہت دینی اثرات تھے، وہ بھی ختم ہو گئے۔ مذہب ایک پرائیویٹ چیز بن گیا۔ "الدین للہ والوطن للجمیع" سعد زغلول کا مشہور فقرہ ہے جو مدت دراز تک مصری وطن پرستوں کا شعار بنا رہا اور شاید

---

[1] سعید حلیم پاشا، اصل میں مصری اور خدیو مصر کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر عثمانی حکومت کی وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے اور ایک مدت تک سیاہ و سپید کے مالک رہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب بھی ہو۔

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر آستانۂ خلافت کی ہمدردی میں دنیائے اسلام میں ایک ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی، مگر ہندوستان کے سوا کہیں یہ ملکی اور جمہوری تحریک نہ بن سکی۔ ہر ملک کے لیے اپنے مسائل مقدم تھے۔ مگر یہ ہلکی سی جنبش بھی ۱۹۲۴ء میں الغائے خلافت کے بعد سکون میں تبدیل ہو گئی۔ اور جہاں تک اقامتِ دین اور احیائے اسلام کی تحریکوں کا تعلق ہے، پوری دنیائے اسلام میں ظلمات بعضہا فوق بعض، کا منظر نظر آنے لگا۔ سلطان ابن سعود کے قبضۂ حجاز سے احیائے نظامِ اسلام کی ہلکی سی امید پیدا ہوئی تھی، مگر سلطان کے اعلانِ ملوکیت نے جلد ہی اس کا خاتمہ کر دیا۔ دنیائے اسلام کی نمائندہ مؤتمر بھی مکہ مکرمہ میں منعقد ہوئی۔ لیکن نشستند و گفتند و برخاستند سے زیادہ وہاں کچھ نہ ہو سکا۔

(۳)

یہ ایک سرسری جائزہ تھا، دنیائے اسلام کی پچھلی سیاسی و دینی تحریکوں کا۔ اب ہم عصرِ حاضر میں آگئے ہیں اور ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی درمیانی مدت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ترکوں کے الغائے خلافت کے بعد ہی سے تمام مسلمان ملکوں کا رجحان قومیت کی طرف بڑھنے لگا۔ اپنی تاریخ، جغرافی حیثیت، ازہر کی بین الملکی پوزیشن اور دوسرے اسباب کے ماتحت مصر کو عربی دنیا کی قیادت حاصل ہے۔ نیز غیر عرب مسلم علاقوں پر بھی اس کے افکار و خیالات اثر انداز ہوتے ہیں۔ مصری مطبوعات تمام دنیائے اسلام میں پھیلتی ہیں۔ مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ بدنصیبی سے مصر، جو عربستان کا فکری منبع اور علمی سرچشمہ ہے، وطن پرستی اور قوم پرستی کا مرکز بن گیا۔ موقع اور بے موقع 'فرعونیت' پر فخر کیا جانے لگا۔ اسلام ہی نہیں، آج سے پچیس برس پہلے 'عربیت' سے بھی مصری وطن پرستوں کو چڑ تھی۔ عبد الرحمٰن عزام اور چند گنے چنے لکھنے والوں کو چھوڑ کر، پوری قوم 'فراعنہ' اور فرعونی تہذیب کے گن گا رہی تھی۔ مصر چھوڑتے وقت سید جمال الدین افغانی کو اطمینان تھا کہ محمد عبدہٗ ان کے مشن کی تکمیل کے لیے کافی ہیں۔ لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیخ محمد عبدہٗ سیاست کے میدان میں بالکل ناکام رہے۔ خالص مذہبی مصلح کی حیثیت سے بھی ان کا موقف کمزور تھا۔ سید جمال الدین کے برعکس، یہ یورپ سے مرعوب تھے اور بسا اوقات ان کا انداز بحث و فکر معذرت خواہانہ (Apologetic)، ہو جاتا تھا۔ ان کے شاگردوں میں سید رشید رضا (ف ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) کے سوا کوئی مرد مجاہد نہ نکلا۔ رشید رضا کا دائرہ عمل بھی محدود تھا۔ اور پھر ترکوں اور عربوں کی کشمکش میں وہ عرب قوم پرستوں کے ہم نوا تھے۔ اس لیے کوئی جاندار اور ہمہ گیر اسلامی تحریک نہ شروع کر سکے۔ آخری دور میں ڈاکٹر عبدالحمید سعید کی سرپرستی اور کوششوں سے جمعیۃ الشبان المسلمین کا قیام عمل میں آیا، جو عبدالحمید سعید کی زندگی تک تہذیبی دائرے کے اندر کچھ نہ کچھ کام کرتی رہی۔

مصر کے علاوہ دوسرے عرب علاقے بھی عرب قومیت کے نشے میں سرشار رہے۔ شمالی افریقہ کے عرب علاقوں (مراکش، الجزائر، تونس) کا حال مشرقی عربستان سے ذرا مختلف رہے۔ وہاں کبھی مغربی قومیت اور وطن پرستی کا زور نہیں ہوا۔ اگر وہ چار راہ سے ہٹے، تو دس بیس ان کی سرکوبی کے لیے بھی موجود رہے۔ لیکن فرانس کے استبداد اور چنگیزی حکومت نے ان غریبوں کو بالکل بے بس اور مجبور کر رکھا ہے۔ ان کے سامنے سب سے بڑا سوال فرانس کے ظلم و جور سے نجات پانا ہے۔

روسی علاقے اس دور میں ظلم و ستم کا شکار رہے اور وہاں اسلام ہی کی بیخ کنی ہوتی رہی۔ چین کے مسلمان، اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شریک درد و الم رہے، اور کسی دینی تحریک کا سراغ ان کے ہاں نہیں ملتا۔ البتہ انڈونیشیا میں سیاسی اور اشتراکی تحریکوں کے پہلو بہ پہلو دینی جماعتیں اور تحریکیں بھی قائم ہوئیں اور چلتی رہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے انجمن محمدیہ اور شرکت اسلام نے اچھے کام کیے۔ بعد میں علماء کی ایک جماعت نہضۃ العلماء کا زور رہا۔ جنگ عظیم کے خاتمے پر جمعیۃ خلافت" بھی قائم ہوئی۔ خلاصہ یہ کہ انڈونیشیا میں اسلامی تحریکیں کسی نہ کسی حیثیت میں موجود رہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس دور میں ترکی اور ایران وطن پرستی اور نسل پرستی کے نشے میں چور رہے۔ افغانستان بھی پر پرزے نکالنے لگا۔ امان اللہ خاں کی ناعاقبت اندیشی سے یہاں بھی حکمران طبقہ غلط راستے پر پڑ گیا۔

(۴)

موجودہ اسلامی تحریکیں اس مقالے کا موضوع "دنیائے اسلام کی موجودہ اسلامی تحریکوں" کا جائزہ لینا ہے۔ سلسلۂ کلام کے لیے اس پس منظر کا بیان کرنا ضروری تھا، جو گو وقت اور موقف کی مناسبت سے بہت مختصر اور مجمل ہے، تاہم اس سے موجودہ اسلامی تحریکوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی۔

۱۔ الاخوان المسلمون جب ہم اسلامی تحریک کا لفظ بولتے ہیں، تو اس سے مراد ایسی تحریک و دعوت ہے جو دین کے کسی خاص جزء پر قناعت کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور جو پوری انسانی زندگی کو دین کا موضوع اور اس کے دائرۂ عمل کے اندر داخل سمجھتی ہو۔

اس نقطۂ نگاہ سے موجودہ اسلامی دنیا کا جائزہ لیا جائے، تو برِصغیر ہند و پاکستان سے باہر الاخوان المسلمون کے سوا اور کوئی تحریک اِن خصوصیات کی حامل نہیں نظر آتی۔ انڈونیشیا اور الجزائر میں بعض اچھی اور فعال تحریکیں چل رہی ہیں، جن کا تذکرہ آگے آتا ہے، لیکن ایسی تحریک، جسے اقامتِ دین اور احیائے نظامِ اسلام کی علمبردار کہا جا سکے، الاخوان المسلمون کے سوا کوئی نہیں۔

خوش قسمتی سے یہ دعوت، عربستان کے قلب اور دنیائے اسلام کے علمی مرکز مصر سے شروع ہوئی اور وہی اب تک اس کا مرکز ہے۔ ذی قعدہ ۱۳۴۷ھ میں، آج سے کوئی تئیس برس پہلے، دار العلوم قاہرہ کے ایک فارغ التحصیل نوجوان حسن البنا نے اس جماعت کی بنیاد رکھی۔ وہ اسماعیلیہ میں ایک ابتدائی مدرسہ کا مدرس تھا اور وہیں اس نے اپنی دعوت پھیلانا شروع کی۔ وہ ایک سیماب وش انسان تھا۔ ایک موہوب شخصیت تھی۔ اس میں بے پناہ کشش تھی ایک طرف اس کے علم، خطابت اور انشا کی صلاحیتوں پہ نظر ڈالتے ہیں، اور دوسری طرف اس عظیم الشان دینی انقلاب کو دیکھتے ہیں جو گذشتہ بیس برس کے عرصہ میں وادیِ نیل میں نمودار ہوا تو عقل حیران

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہ جاتی ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ۔ ظاہری طور پر اس انقلاب کی کوئی علمی وعقلی توجیہ نہیں ہو سکتی جب عرب ملکوں میں فرعونیت اور نمرودیت کا کلمہ پڑھا جانے لگا، خاندانِ نبوت کے گُلِ سر سبد امیر فیصل بن حسین نے آن العرب کا نواعرتا قبل محمد وموسیٰ (عرب، محمد اور موسیٰ سے پہلے بھی عرب تھے) کا نعرہ بلند کیا، اور جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے عرب نوجوان علی الاعلان اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کرنے لگے اور دمشق یونیورسٹی میں خدا کا جنازہ نکالا گیا تو غیرتِ حق کو جنبش ہوئی۔ وہ زمین جہاں محمد عبدہٗ ناکام رہے، وہ خطۂ ارض جہاں سید رشید رضا کی چہل سالہ کوششیں اپنا ایک جانشین نہ پیدا کر سکیں، جہاں آج سے ربع صدی پیشتر پارکوں اور باغوں میں اچھے خاصے مسلمان نماز پڑھتے ہوئے شرماتے تھے، جہاں بیس پچیس برس پہلے یہ حال تھا کہ جو سر پھرا جب چاہے اللہ ورسول کی شان میں زبانِ طعن دراز کرے، جہاں سیاسی مجلسوں میں "اسلام" کا نام لینا حرام سمجھا جاتا تھا —— مشیتِ ایزدی نے اسی سرزمین میں ایک نوجوان سے وہ کام کرایا جو بڑے بڑے علماء ومشائخ سے بھی نہ ہو سکا تھا۔

دینِ حق کے اس متوالے نے ہمہ گیر انقلاب وتجدید کی دعوت دی۔ اس نے ہر تقریر، ہر خطبے میں برملا کہا کہ "اسلام ایک دین ہے۔ نظامِ زندگی ہے۔ دنیا اور آخرت کے تمام مسائل کا حل اسی کے پاس ہے۔" جانے اس کی آواز میں کیا کشش تھی، اس کی نشست وبرخاست میں کیا جاذبیت تھی، کہ اس کے بچپن کے دوست، بھائی، والد ماجد اور استاذ، سب کے سب اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی قیادت میں دعوت کے علمبردار بن گئے۔ ہر طبقے سے کھنچ کھنچ کر اور ہر طرف سے ٹوٹ ٹوٹ کر لوگ اس کی طرف آنے لگے۔ اللہ کی شان! کفر والحاد کے قلعے پہلے مسمار ہوئے یعنی ان کی دعوت پر لبیک کہنے والوں میں یہی کالجوں کے بدنام تعلیم یافتہ نوجوان آگے آگے تھے۔ عام علماء کو جبہ ودستار اور علمائے ازہر کو منصب اور گریڈ کی حفاظت سے کہاں فرصت؟ البتہ علماء کو یہ توفیق ضرور نصیب ہوئی کہ جب حکومتِ مصر نے اس تحریک کے استیصال کی کوشش شروع کی تو ان میں سے بعض نے اخوان سے علی الاعلان بیزاری کا اظہار کیا اور بعض نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کی تکفیر کے فتوے دیئے۔

یہ تحریک ہماری آنکھوں کے سامنے اٹھی، پروان چڑھی اور پھلی پھولی۔ اسماعیلیہ میں حسن البنا کا لگایا ہوا پودا دیکھتے دیکھتے لہلہاتا گلزار بن گیا۔ ہم نے ابتدا سے اس کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے تمام مرحلوں پر ہماری نظر رہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دوسری جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہوتے "الاخوان المسلمون" مصر میں ایک ٹھوس اور زندہ تحریک بن چکی تھی۔ انگریز اس خطرے کو شروع ہی میں بھانپ گیا تھا۔ جہادِ فلسطین کے سلسلے میں "اخوان" کی سرگرمیوں نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شام، عراق، شرق اردن اور فلسطین وغیرہ میں بھی اس کی بنیادیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ یہ دیکھ کر برطانیہ کے کان کھڑے ہوئے اور محمود فہمی نقراشی (وزیر اعظم مصر) انگریزوں کے دباؤ میں آکر "الاخوان" کو خلافِ قانون قرار دینے کی غلطی کر بیٹھا۔ بس پھر کیا تھا؟ ہزاروں ہزار آدمی جیلوں اور دُور دراز کیمپوں میں بند کر دیئے گئے۔ مظالم اور سختیوں کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک مسلمان نام رکھنے والی حکومت نے کسی اسلامی جماعت پر شاید ہی ایسے مظالم کبھی روا رکھے ہوں۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ الاخوان کی پوری جماعت جیلوں میں ٹھونس دی گئی مگر . . . . .

نگران کے "مرشد عام" تحریک کے داعی حسن البناء کو گرفتار نہیں کیا گیا! کیوں؟ بدبختوں کی نیت ہی کچھ اور تھی۔ ۹ دسمبر ۱۹۴۸ء کو "الاخوان المسلمون" خلاف قانون قرار دی گئی، اور ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کی ایک نامبارک شام کو جمعیۃ الشبان المسلمین کے دفتر کے سامنے، شارع عام پر حسن البنا شہید کر دیئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ورحمۃ اللہ الابرار الصالحین من عبادہ۔ جذبۂ انتقام اب بھی فرو نہیں ہوا۔ ہسپتال کا محاصرہ کر لیا گیا۔ نہتے شہید کے بوڑھے باپ، مشہور عالم حدیث و خادم سنت شیخ ابو عبدالرحمٰن احمد البنا نے تن تنہا نماز جنازہ ادا کی۔ اور میت! ہاں میت کو ان کے گھر کی مستورات نے آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔ کسی اللہ کے بندے کو تعزیت کی اجازت بھی نہیں تھی — "اللہ رے" جذبۂ انتقام!! انتقام کس چیز کا؟ اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے دین کی طرف دعوت دینے کا!! ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن جور و ستم کی کھیتی ہمیشہ سرسبز نہیں رہتی یعنی وزارت کا آفتاب اقبال لب بام ہونے کو آیا۔ نقراشی پاشا کے جانشین ابراہیم عبدالہادی کا دورِ فرعونیت ختم ہوا۔ مارشل لا کی میعاد بھی پوری ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ قدرتی طور پر اخوان کی رہائی عمل میں آگئی، گو جماعت خلاف قانون رہی۔ موجودہ برسر اقتدار پارٹی، جو جمہور کی نمائندہ اور آئین و دستور کی پابندی کا دعویٰ کرتی ہے، اخوان کے دبانے کے لیے دوسری چال چل رہی تھی، مگر اس میں ناکام رہی۔ وفد پارٹی چاہتی تھی کہ اخوان والے ایک مذہبی انجمن کی حیثیت سے کام کریں اور سیاسیات سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ پارلیمنٹ نے قانون بھی پاس کر دیا۔ لیکن اخوان کے کارکن اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اور کئی مہینوں سے الاخوان اور حکومت کے درمیان کشمکش چل رہی ہے[1]۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انتہائی شرمناک اور وحشیانہ مظالم کے باوجود چار ہزار اخوانی نظربندوں میں سے ایک بھی راہِ حق سے نہیں ہٹا اور کسی کے پائے استقامت میں لغزش تک نہیں آئی۔ فجزاھم اللہ عن الاسلام خیرالجزاء۔

ان سب کے باوجود دعوتِ حق کا کام پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ مصر کے گاؤں گاؤں میں شاخیں پھیلتی جا رہی ہیں۔ شام اور عراق کی جماعتیں گو اپنی تنظیم اور قیادت کی حیثیت سے مستقل وجود رکھتی ہیں، مگر الاخوان جہاں ہوں اخوان ہی ہیں۔ شام کی جماعت پارلیمنٹ میں کافی اثر رکھتی ہے اور نئے دستور میں ان کی جدوجہد کے آثار نمایاں ہیں۔ شرق اردن میں بھی ان کی تحریک مضبوط اور جاندار ہے۔ سعودی عرب میں شخصی حکومت اور انتہائی استبداد کی وجہ سے جلد کسی تحریک کا اُبھرنا دشوار ہے۔ البتہ حج کے موقعہ پر الاخوان والے اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور اس عالمی اجتماع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حسن البناء مرحوم خود بھی ہر سال حج کے موقع پر دعوت و تبلیغ میں سرگرم رہا کرتے تھے۔ اب ان کے شاگرد اور رفیق

[1] تازہ خبر یہ ہے کہ مصر کے موجودہ حالات میں الاخوان کی پیش قدمی اور سپریم کورٹ (مجلس الدولہ) کے فیصلے کے پیش نظر حکومت نے تمام پابندیاں ہٹالی ہیں اور الاخوان کی تمام ضبط شدہ املاک بھی واپس کر دی گئی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کام کو کر رہے ہیں۔ مغرب (یعنی مراکش و الجزائر و تونس) میں بھی ان کا خاصہ اثر ہے۔ مگر، جیسا کہ راقم عرض کر چکا ہے، مغربی عربستان کے سامنے پہلا سوال فرانس کے شیطانی اقتدار سے نجات پانا ہے۔ موجودہ طاغوتی حکومت اور شیطانی استبداد کے آہنی شکنجوں کے اندر وہاں کسی جاندار اسلامی تحریک کا پنپنا بہت مشکل ہے۔ بہرحال یہ اس تحریک کی برکت ہے کہ بیس سال کے اندر تمام عربی ممالک میں ذہنی، اخلاقی اور تہذیبی حرکت کا رُخ بدل گیا ہے۔ قوم پرستی الحاد اور مغربی تقلید کا زور گھٹ گیا ہے۔ اسلام کی قدر، اس کی محبت اور اس کی پیروی کا جذبہ جو بالکل سرد پڑ چکا تھا، از سر نو زندہ ہو گیا ہے اور روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ مصر میں آج وہی قلم جو کل تک الحاد پھیلا رہے تھے، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور نظام اسلامی کی تعریف و توصیف میں کتابیں لکھ رہے ہیں۔

یہ تھا سرسری جائزہ الاخوان المسلمون اور اس کی سرگرمیوں کا۔ یہ تفصیل کا موقع نہیں، اور نہ اس جائزے کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں ان کے طریق کار کی تمام جزئیات سے اتفاق ہے۔ البتہ اس بات کی ہم پورے انشراح صدر کے ساتھ شہادت دیتے ہیں کہ یہ جماعت پورے دین کی طرف دعوت دیتی ہے اور اس کا مقصد اقامت دین و احیائے نظام اسلامی کے سوا کچھ نہیں۔ الاخوان کی تاریخ، اس ملک میں اقامت دین کا کام کرنے والوں پر ایک قرض ہے۔ اللہ کرے، یہ سعادت اسی گنہگار کے حصے میں آئے۔

۲۔ ماشومی پارٹی[1] الاخوان کے بعد، انڈونیشیا کی ماشومی پارٹی کسی نہ کسی حد تک دین کی جامعیت اور ہمہ گیری کا تصور رکھتی ہے اور اس کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔

انڈونیشیا میں کوئی دور نیم دینی تحریکوں سے خالی نہیں رہا۔ البتہ ملک گیر نیم دینی و نیم سیاسی تحریک، تحریک خلافت کے سلسلے میں اٹھی۔ ۱۹۲۲ء میں مرکزی خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور پھر ۱۹۲۶ء میں مؤتمر اسلامی مکہ مکرمہ کی شاخ کا قیام بھی عمل میں آیا، لیکن ان کا اثر جلدی ہی کم ہو گیا۔

---

[1] غلطی سے ہمارے ملک کے اخبارات میں اس کا نام مسجومی پارٹی چل پڑا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمہید میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہاں محمدیہ اور نہضۃ العلماء کے نام سے دو مذہبی جماعتیں کام کر رہی تھیں ۱۹۴۳ء میں ان دونوں کے کارکنوں نے دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر "المجلس الاسلامی الاعلیٰ الانڈونیسی" قائم کی لیکن پچھلی بڑی لڑائی کے دوران میں اس کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔

جنگ کے خاتمہ اور اعلان آزادی کے بعد تمام مسلمان انجمنوں اور اداروں کی ایک مشترک کانفرنس منعقد ہوئی جس کا نام "مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا" رکھا گیا۔ "ماشومی" اسی کا مخفف ہے اور عام طور پر یہ پارٹی "ماشومی" ہی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے دستور میں یہ دفعہ بھی شامل ہے:۔

"جہاں تک ملک کی حکومت اور سیاست کا تعلق ہے، اسلام کے مقاصد کو پورا کرنا"۔

پارٹی کا کام متنوع ہے اور اس کے اراکین بھی مختلف الخیال ہیں۔ کوئی فکری ہم آہنگی نہیں معلوم ہوتی۔ فروری ۱۹۵۱ء میں موتمر کے موقع پر جو انڈونیشیا کا وفد آیا تھا، اس کے تمام ارکان "ماشومی" کے ممبر تھے۔ آپ کو سن کر شاید حیرت ہو کہ رئیس وفد شمس الرجال صاحب قادیانی رجحان رکھتے تھے۔ یہ مجھ سے خود وفد کے دو ذمہ دار اور اہل علم ارکان نے بیان کیا۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "ماشومی پارٹی" کے لیڈر ڈاکٹر ناصر جو ان دنوں وزیر اعظم تھے، ذرا نرم واقع ہوئے ہیں اور اصولوں میں مصالحت بھی کر لیتے ہیں۔

ایک اور جماعت دار الاسلام کے نام سے بھی ہے۔ یہ تشدد کی علم بردار ہے اور اس کے خیالات بھی سلجھے ہوئے نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہماری رائے میں انڈونیشیا میں اسلامی فکر موجود ہے۔ گو واضح نہیں۔ کمیونزم کے مقابلے میں اسلام کی بنیادیں وہاں مستحکم ہیں۔ یہ لوگ اچھا کام کر رہے ہیں۔ اگر انہیں فکری غذا بہم پہنچائی جائے، تو کامیابی کے نمایاں امکانات ہیں۔

۳۔ مغربی عربستان کی جماعتیں | مغربی عربستان یعنی شمالی افریقہ میں مشرق کی بہ نسبت دینداری اور دینی جذبہ زیادہ ہے۔ تونس کے سوا اب تک کہیں اس قسم کی فرنگیت نہیں آئی جیسی مصر و شام، یا پاکستان و ہندوستان میں آج پائی جاتی ہے۔ عالم اسلام کی تینوں مشہور درسگاہیں افریقہ میں ہیں۔ دو تو خاص مغرب میں ہیں — فاس (مراکش)، کی جامع القرویین۔ اور تونس کی جامع الزیتونہ۔ تیسری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جامع ازہر مصر کی جغرافی حیثیت کے لحاظ سے مشرق و مغرب کے درمیان مشترک ہے۔

امیر عبدالقادر کے بعد الجزائر پر فرانس کا براہِ راست تسلط ہو گیا ہے۔ مراکش اور تونس پر بھی فرانس ہی کا سکہ چلتا ہے اگرچہ بالواسطہ۔ اور فرانسیسی اقتدار اپنی بہیمیت، سفاکی اور بے آئینی میں اسپین کے عہد ظلمت کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مراکش کے سلاطین پشتہا پشت سے اہل علم و اہل قلم رہے ہیں۔ مگر فرانسیسی بھیڑیوں کے ہاں علم و ہنر کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ صرف استعمار (Colonisation) چاہتے ہیں۔ اپنے ملک میں وہ لادینیت اور جمہوریت کے علم بردار ہیں۔ مگر مغربی عربستان میں مذہبی اداروں کو حکومت کے تصرف و اقتدار میں رکھنا ان کے پروگرام میں داخل ہے۔ جمہوریت تو خیر ایک ایسا پودا ہے جو ان استعمار پسندوں کے نزدیک یورپ سے باہر برگ و بار ہی نہیں لا سکتا۔

تمہید مختصر کرتے ہوئے عرض ہے کہ مغربی عربستان میں فرانسیسی استبداد کے باعث، تمام صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے، اب تک کوئی ہمہ گیر اسلامی تحریک نہ اُبھر سکی اور جب تک یہ شیطانی حکومت وہاں موجود ہے، کسی تحریک کا اٹھنا مشکل ہے۔

مغربی عربستان میں طرابلس الغرب، مشرق سے قریب ہے اور اٹلی کے تسلط کی وجہ سے سب سے زیادہ اسی کو قربانیاں اور مصائب برداشت کرنا پڑے ہیں۔ تیس بیالیس سال کی مسلسل جدوجہد اور مختلف تباہیوں سے گزرنے کے بعد یہ علاقہ اب آزادی سے ہم کنار ہو رہا ہے اور سنوسی اعظم کے چچازاد بھائی محمد بن ادریس سنوسی بادشاہ بنائے گئے ہیں۔ اسلامی دعوت کے لحاظ سے اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ ابھی کچھ کہنا دشوار ہے۔

اس کے بعد تونس آتا ہے۔ یہاں مغرب پرستی، مراکش اور الجزائر سے زیادہ ہے۔ گو الاخوان کے اثرات بھی پہنچ رہے ہیں۔ اور پھر جامع الزیتونہ یہیں ہے، جہاں الجزائر سے بھی طلبہ تعلیم کے لیے آتے ہیں۔ اس وقت پورے مغربی عربستان کی سیاست مشہور مجاہد امیر محمد بن عبدالکریم ریفی کی سرپرستی اور نگرانی میں چل رہی ہے۔ امیر محمد بن عبدالکریم ایک طرف باضابطہ عالم، جامع القرویین کے فارغ التحصیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور قضائے شرعی کے منصب پر فائز رہ چکے ہیں، اور دوسری طرف سیاست کاری اور میدانِ رزم وغا کے ایسے شہسوار ہیں کہ بیسویں صدی میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان کی نگرانی و سربراہی سے توقع ہے کہ تونس کے دو چار سرپھرے یورپ زدہ سیاسی لیڈر زیادہ ہاتھ پاؤں نہ مار سکیں۔

مغرب کے آخر میں مراکش ہے اور اسی لیے اسے مغرب اقصیٰ بھی کہتے ہیں۔ اس کے تین حصے کیے گئے ہیں۔ بڑا ٹکڑا فرانس کے زیر اقتدار ہے اور وہاں مظلوم و مجبور مولای عبدالحفیظ سربرائے حکومت ہیں۔ دوسرا ٹکڑا اسپین کے زیر اثر ہے۔ وہاں اسی شاہی خاندان کی ایک دوسری شاخ کو برائے نام بادشاہت سونپ دی گئی ہے۔ تیسرا علاقہ جو ان دونوں سے چھوٹا ہے بین الاقوامی منطقہ کہلاتا ہے اور اس کا صدر مقام طنجہ ہے۔ ان تینوں علاقوں کے مسلمان دیندار، علم کی طرف مائل اور اصلاح کو قبول کرنے والے ہیں۔ مراکش کے سب سے بڑے لیڈر علّال الفاسی بڑے ادیب، لغوی، بلند پایہ شاعر اور محقق عالم ہیں۔ اہلِ مغرب یوں بھی عربی زبان دانی میں پورے عرب میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

تونس اور مراکش کے وسط میں الجزائر ہے۔ یہاں فرانس کی براہ راست حکومت ہے۔ مراکش اور تونس کی طرح مسلمان بادشاہ نہیں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مغربی عربستان کی سب سے عظیم الشان مذہبی، تعلیمی و تہذیبی تحریک یہیں ابھری اور حکومت کی تمام سختیوں کے علی الرغم دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

امیر عبدالقادر جزائری کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کا جہاد اور ان کے ساتھیوں کی جدوجہد الجزائر کے استخلاص کی آخری منظم کوشش تھی۔ ۱۸۴۵ء میں وہ ہتھیار رکھنے پر مجبور ہوئے، وہ دن ہے اور آج کا دن، الجزائر پر فرانس کا غاصبانہ اقتدار قائم ہے۔ فرانس نے کوشش کی کہ مذہبی تعلیم اور عربی زبان کو ملیا میٹ کر کے عربوں کو آہستہ آہستہ عیسائی یا کم از کم لامذہب بنا دیا جائے۔ اس کے لیے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ مشنریوں کی خوب خوب حوصلہ افزائی کی گئی۔ سرکاری تعلیم گاہوں میں عربی زبان کی تعلیم آہستہ آہستہ موقوف کی جانے لگی۔ مساجد و اوقاف اور تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمان ادارے، حکومت نے اپنے تصرف میں لے لیے۔ ان حالات میں آج سے تیس برس پہلے اللہ کے ایک صالح و مخلص بندے عبدالحمید بن بادیس نے اصلاح و تجدید کا علم بلند کیا۔ یہ کتاب و سنت کے محقق عالم، عربی زبان کے اچھے ادیب و انشا پرداز، خیالات میں سلجھے ہوئے اور عقائد و فقہ میں طریقۂ سلف کے پیرو تھے۔ محمد عبدہٗ، سید رشید رضا اور شام کے عبدالرزاق البیطار اور جمال الدین قاسمی کی صف میں انہیں جگہ دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ٹھوس بنیادوں پر کام شروع کیا۔ ۱۳۴۳ھ میں ایک ماہانہ رسالہ "الشہاب" بھی جاری کیا۔ نیز "الصراط"، "الشریعۃ" اور "السنۃ" مختلف ناموں سے ہفتہ وار اخبار بھی نکالتے رہے۔ ۱۳۵۱ھ سے یہ تمام رسالے اور اخبار راقم کی نظر سے گزرتے رہے ہیں اور یہ شہادت دے سکتا ہے کہ ان کا معیار ہمارے ہاں کے بڑے سے بڑے علمی رسالوں سے کم نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ابتدائی درس گاہوں کا ایک جال پھیلانا شروع کیا۔ خود قسنطینہ میں درس دیتے تھے اور ان کے شاگرد و رفقاء الجزائر کے گوشے گوشے میں دعوت پہنچا رہے تھے۔ صوفیوں اور علماء سوء نے بڑی مخالفتیں کیں۔ راہ میں روڑے اٹکائے لیکن ان کی دعوتِ اصلاح ترقی ہی کرتی گئی۔ اسی دوران میں "جمعیۃ العلماء المسلمین الجزائریین" کی باضابطہ تنظیم عمل میں آئی۔ حکومت اور جاہل صوفیوں کو یہ دعوت ایک آنکھ نہ بھائی۔ حریفوں کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں، تا آنکہ اس مردِ مجاہد کو زہر دے دیا گیا، جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا (۱۳۵۹ھ)۔ لیکن دعوت کا کام ان کے بعد اور بھی تیز ہو گیا۔ جمعیۃ العلماء کے موجودہ صدر، جمعیۃ کے آزاد مدارس کے نگرانِ اعلیٰ اور اس کے ہفتہ وار آرگن "البصائر" کے چیف اڈیٹر شیخ محمد بشیر ابراہیمی، اپنے علم و تجربے کے اعتبار سے، عربستان کے چند گنے چنے افراد میں ہیں۔ جہاں تک عربی انشا پردازی کا تعلق ہے، راقم کی رائے میں، اس وقت کوئی ان کا حریف نہیں ہے۔ "البصائر" تمام عرب علاقوں میں، بہترین اصلاحی اخبار شمار کیا جاتا ہے۔ "البصائر" کی ہفتہ وار سیاسی خبروں کی جامعیت ہمارے ہاں کے بلند سے بلند اخباروں میں نہیں ہوتی۔ "جمعیۃ العلماء" کے مدرسے، ابتدائی اور ثانوی حکومت کی امداد و اعانت سے بالکل بے نیاز اور ایک خاص نظامِ تعلیم کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ اس نظامِ تعلیم کو آپ مدرسۃ الدعوۃ والارشاد (مصر) اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نظام اور مسلک اعتدال سے قریب کہہ سکتے ہیں

افسوس کہ اس مختصر صحبت میں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں۔ آپ اتنا سمجھ لیں کہ جمیعۃ العلماء حکومت کے سیکولر بلکہ مسلم کش نظام تعلیم کے مقابلے میں ایک متوازی نظام کامیابی کے ساتھ چلا رہی ہے اور اس کے ثمرات زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ حکومت پریشان ہے کہ کیا کرے؟ طرح طرح کے روڑے اٹکاتی ہے، مگر یہ تہذیبی اور مذہبی اصلاح کی دعوت نہایت خوبی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، موجودہ دور میں کسی مسلمان ملک میں ایسے منظم اور آزاد نظامِ تعلیم کا سراغ نہیں ملتا۔ گویا اقامتِ دین کی تحریک نہیں، مگر اس سے قریب کرنے والی اور دل و دماغ کو اس کے لیے تیار کرنے والی ہے۔

باقی ممالک | باقی مسلمان ملکوں میں اسلامی تحریک کا نام و نشان بھی نہیں۔ روس کے مسلمان تو مقہور و مظلوم ہیں اور شاید اب چین میں بھی یہی حال ہو۔ ارکان (برما) میں ایک حرکت پیدا ہوئی، مگر اسے نہ فکری غذا مل رہی ہے اور نہ مادی۔ خطرہ ہے کہیں اسی حال میں دم نہ توڑ دے۔ افغانستان پر نسل پرستی اور قوم پرستی کا نشہ سوار ہے۔ ترک کا خمار تو اتر چکا، مگر اب اس نے امریکا کی آغوشِ شفقت کو اپنی جائے پناہ بنا لیا ہے۔ اللہ رحم کرے۔ قوم میں اسلامی جذبہ ہے لیکن صحیح شعور اور تنظیم کی کمی ہے۔ اسکی شہر کے ایک صوفی بدیع الزماں نورس کے زیر قیادت کچھ نہ کچھ انفرادی مذہبی کام ہو رہا ہے، مگر اطمینان بخش نہیں۔ ایران کا حال عجیب و غریب ہے۔ ایک طرف وہاں کمیونزم کی بنیادیں جڑ پکڑ چکی ہیں اور ہوشیار دشمن موقع کی تاک میں ہے۔ دوسری طرف صحیح شعور و فکر سے بے بہرہ، مظاہروں اور نعروں پر دل بہلانے والے مذہبی لیڈر ہیں۔ صرف انگریز دشمنی اور انگریزوں کو "کتا" کہہ کر پکارنے سے کمیونزم کے خطرات کا سدِّباب نہیں ہو سکتا۔ ابوالقاسم کاشانی بھی، ہمارے ہاں کے بعض سیاسی لیڈروں کی طرح مظاہرے اچھے کرا سکتے ہیں، مگر اقامتِ دین اور احیائے نظامِ اسلام کا کوئی صحیح تصور شاید ان کے ذہن میں نہیں ہے۔

اس مختصر جائزے کے بعد اللہ سے ہدایت، استقامت اور توفیقِ عمل کی دعا کرتا ہوا رخصت ہوتا ہوں۔ آپ بھی آمین کہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

© rasailojaraid.com